پاکستان

برادری ازم، سیاست اور سرپرستی

اناٹول لیون

ترجمہ: محمد صفدر سحر

مشعل بکس

آر/بی 5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

پاکستان

برادری ازم، سیاست اور سرپرستی

اناٹول لیون

ترجمہ: محمد صفدر سحر

ناشر: مشعل بکس
آر/بی/5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن،
لاہور 54600، پاکستان

فون وفیکس 042-35866859
Email: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

فہرست

پاکستان بطور ریاست

پاکستان بطور ریاست کمزور ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ برادری ازم ہے۔نہ صرف اس حوالے سے کہ ملکی وسائل کی لوٹ کھسوٹ میں سیاسی سرپرستی سے یہ جڑی ہے بلکہ اس کی وجہ سے مقامی سطح تک لوگوں کی حتیٰ کہ قانون نافذ کرنے والے اور دیگر اداروں کے اہلکاروں کی وفاداری ریاست کی بجائے برادری سے ہے اور جو اقتدار اعلی ریاست کا حق تھا وہ برادری کو مل چکا ہے۔یوں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغربی ریاستوں کو سامنے رکھیں تو پاکستان تشکیل ریاست کے ابتدائی مراحل میں ہے جہاں ادارے باقاعدہ شکل میں موجود ہیں۔

برادری ازم کی بنیاد پر وفاداری کے بڑھتے رجحان کے علاوہ پاکستانی ریاست کو ایک اور مسئلے کا بھی سامنا ہے اور وہ یہ کہ متبادل وفاداریوں کے درمیان معاندانہ چپقلش پائی جاتی ہے۔نسل پرستی کا بڑھتا رجحان جہاں معمولی سطح پر پاکستان کے لیے قربانیاں نہ دینے کا جذبہ پیدا کر رہا ہیں وہاں اپنی انتہائی حالت میں دوٹوک انداز میں علیحدگی کے مطالبات بھی سامنے آ رہے ہیں جیسا کہ پشتونوں،سندھیوں اور بلوچوں کی طرف سے یہ مطالبات آ بھی چکے ہیں۔وفاداری کی ایک اور قسم مذہبی

فرقوں کے ساتھ وفاداری ہے جو خاصی قدیم ہے بلکہ اسلامی تاریخ کے حوالے سے دیکھیں تو اسلام کی اولین دہائی میں ہی یہ سامنے آ گئی تھی۔اس قسم نے گزشتہ کچھ عرصے میں ریاست پاکستان کے خلاف علم بغاوت بلند کر رکھا ہے۔(1)

ملک میں چونکہ برادری ازم اہم سماجی طاقت بن چکی ہے، اسی وجہ سے سیاسی نظام میں بھی اس کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔جنوبی ایشیا کے دیگر ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی سیاسی جماعتیں وراثتی بن چکی ہیں۔ پی پی پی بھٹو خاندان کی پارٹی ہے۔ مسلم لیگ ن شریف فیملی کی ملکیت ہے جبکہ عوامی نیشنل پارٹی پر ولی خان کے خاندان کی وراثت کا حق مسلمہ ہے۔ ان سیاسی جماعتوں کی بنیادی اکائیاں ، یعنی مقامی سیاسی ڈھانچے بھی مقامی سیاسی خاندانوں سے تشکیل پاتے ہیں۔ایم کیو ایم اور کچھ مذہبی جماعتوں کے علاوہ تمام سیاسی جماعتوں کی پاکستان میں قیادت جاگیرداروں، قبائلی سرداروں یا شہری سرمایہ کاروں کے پاس ہے جو ریاست کی سرپرستی کو نہ صرف اپنے فوائد اور اپنی وراثتوں کو محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں بلکہ اس مقامی سیاسی گھرانوں کو بھی تحفظ دیتے ہیں جو ان سے وابستہ ہیں۔ سیاستدانوں کی اکثریت وہ ہے جن کے والدین یا رشتے دار اس میدان میں ہیں۔ کوئی نئی سیاسی قوت بھی اگر ملک میں پیدا ہوتی ہے تو وہ اس سیاسی طاقت کو وراثت میں اپنے بچوں کو دے جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں جو جاگیردار بچ گئے ہیں ان کی طاقت کا دائرہ بڑی بڑی جاگیروں تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اپنے قبیلے کے سردار بھی ہوتے ہیں۔اس قسم کا اختیار و اقتدار نیچے تک سفر کرتا ہے۔جس طریقے سے انفرادی سطح پر جاگیردار جاگیرداری نظام میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں (جیسے اٹک کا گجر خاندان، جو سٹیفن لیان کی تحقیق کا مرکز تھے)، اس سے انہیں بے تحاشا توانائی

اور لچک حاصل ہو جاتی ہے کہ وہ دیہی علاقوں بلکہ پورے ملک کی سیاست میں فعال کردار ادا کر سکیں۔(2)

ایک بار سندھ کے ایک جاگیردار سیاستدان نے مجھے بتایا" پاکستان ایک سخت ملک ہے، آپ کو تحفظ کے لیے سیاسی خاندان یا قبائلی تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے۔اس لیے جو لوگ آپ کے ساتھ ہوتے ہیں وہ ہر حال میں آپ کے لیے قربانیاں دینے پر تیار رہتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آپ حکومت میں نہ بھی ہوں تو سیاسی طور پر طاقتور رہتے ہیں۔قبائلی نظام میں لوگ اپنے لوگوں کے تحفظ کے لیے جھوٹ بول سکتے ہیں، عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دے سکتے ہیں بلکہ اگر ضرورت ہو تو آپ کا بدلہ بھی لیا جاتا ہے۔"(3)

برطانوی قبضے کے دور میں بھی بلوچ اور پشتون قبائل کے باہر اجتماعی دفاع کا نظام شاذ ہی نظر آتا ہے۔ایسی ریاست جہاں کوئی بھی ریاستی ادارہ قابل اعتماد نہ ہو وہاں لوگ متشدد پولیس، کورٹس اور سیاست میں قبائلی تعلقات پر زیادہ انحصار کرتے ہیں۔

کمزور ریاست اور طاقت ور جاگیرداروں اور قبائلیت وہ وجہ ہے کہ شہری آبادی میں ہونے والا اضافہ مطلوبہ اثرات سیاسی نظام پر نہیں ڈال سکا۔ بلکہ پاکستان میں الٹا ہی ہوا کہ شہری زندگی سیاسی نظام کی تحلیل کی بجائے وہ لوگ جو دیہی علاقوں سے شہروں میں آ کر بسے انہوں نے دیہی اقدار کو شہروں میں آ کر رواج دے دیا۔ شہری علاقوں میں آ کر بھی جو ہاری اور کسان آباد ہوئے وہ اپنے قبائل اور قوموں سے جڑے رہے۔ یہ وہ وجہ ہے کہ شہری علاقوں میں بھی معیشت کے ماڈرن سیکٹرز کی بجائے، جو سرے سے موجود ہی نہیں، شہری افراد سیمی یا بے قاعدہ طریقہ ہائے روزگار سے وابستہ ہیں۔

یہ ایک فطری نتیجہ ہے کہ استبدادی ریاست سے دفاع کے لیے جب برادری کا تحفظ ضروری ہے، تو ایسی ریاست خود بھی ظالم ریاست بن جاتی ہے کیونکہ یہی برادریاں مخالف برادریوں کے مقابلے میں زیادہ طاقت، غلبے اور دولت کے حصول کے لیے ریاست کو استعمال کرتی ہیں۔ محمد اعظم چوہدری کے الفاظ میں: (4)

''ہائی کورٹس کے نیچے کرپشن کا راج ہے۔ نہ قانون نہ عدالتی نظام، بھروسہ صرف اس ایک حقیقت پر کیا جاتا ہے کہ آپ کسے جانتے ہیں، کون موثر آدمی ہے اور اسے آپ کو رقم دینی ہے''

اس کے علاوہ پاکستانی اشرافیہ کی طاقت کا انحصار مقامی برادریوں کی طاقت پر اور وسائل پر ان کے قبضے پر بھی ہے، اس سے اشرافیہ کو ٹیکس بچانے میں سہولت ملتی ہے جس کی وجہ سے ریاست انفراسٹرکچر اور سروسز پر زیادہ سرمایہ کاری کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔

باقی پاکستانی سماج کے مقابلے میں پاکستان کی فوج کی خوبیاں ان چار اسمائے صفت میں جمع کیے جا سکتے ہیں: علیحدگی، بھرتی، دولت اور حوصلہ مندی۔ یہ چاروں اوصاف پاکستان آرمی کو برطانوی فوج سے ملے ہیں جہاں سے یہ فوج اخذ کی گئی تھی اور جس کا ڈھانچہ اب تک ویسا ہی ہے۔ 1857 کے غدر کے بعد انگریزوں کو مقامی فوج کی وفاداری پر سنجیدہ شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ ان خدشات کے خاتمے کے لیے انہوں نے متعدد قدم اٹھائے۔ ان میں اہم ترین قدم فوج کی علیحدگی اور عام ہندوستانی سماج سے فوجیوں کو دور رکھنا تھا۔ انہوں نے فوج میں بھرتی کے لیے نسلوں اور علاقوں کو محدود کر دیا۔ اور نہ صرف فوجیوں بلکہ ان کی فیملی کے لیے انعامات کا سلسلہ شروع کیا۔

1857 تک برطانیہ کی روایتی مقامی فوج میں بہار اور اودھ سے سپاہی لیے

جاتے تھے، مگر غدر کے بعد انہوں نے یہ پالیسی بدل لی۔ دوسری طرف انہی سالوں میں فتح کیے گئے پنجاب کے سکھ اور مسلمان سپاہی جو اس غدر میں برطانیہ کے وفادار رہے تھے وہاں سے بھرتی کی پالیسی شروع کی۔ مسلمانان پنجاب نے اس وجہ سے بھی انگریزوں سے ہمدردی دکھائی کہ انگریزوں نے ہی انہیں ظالم سکھ حکومت سے نجات دلائی تھی۔ علاوہ ازیں ایک اور وجہ بھی بھرتی کے اس نظام کے پیچھے سرگرم تھی اور وہ تھا انگریزوں کا تعصب ان کے نزدیک صاف رنگت کے پنجابی اور پٹھان مارشل قومیں تھیں۔ یہ وہ تعصب ہے جو ان بھارتی اور پاکستانی پنجاب کی قوموں میں دیگر قوموں کے حوالے سے آج بھی موجود ہے۔

1920 کی دہائی تک برطانوی فوج کا 84 فیصد پنجاب، سرحد اور نیپال (گورکھے) تک محدود تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانوی فوج کا تیس فیصد حصہ پنجابی مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ ان پنجابی مسلمانوں کی اکثریت بھی شمال مغربی پنجاب کے سرحد سے ملحقہ علاقے پوٹوہار کے علاقے سے ہوتی تھی جہاں راولپنڈی میں برطانوی فوج کا مرکزی ہیڈکوارٹر اور ڈپو تھا۔ ان علاقوں کے جاٹ، راجپوت، اعوان، گکھر اور گجر قبائل اور ملحقہ صوبہ سرحد کے چند اضلاع میں آج بھی پاکستان فوج کی کثیر تعداد بھرتی کی جاتی ہے۔ (5) پاکستانی فوج کا 80 فیصد حصہ پندرہ فیصد سے بھی کم پاکستانی آبادی سے منتخب کیا جاتا ہے۔ اس فوج کو سندھ، بلوچستان اور پشتون علاقوں میں اندرونی بغاوتوں کو دبانے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے (اگرچہ اس سے فوج کا مورال پست ہوا ہے)۔

جب بھی شمالی پنجاب میں بے چینی پھیلتی ہے تو فوج کی ہائی کمان فوجیوں کی وفاداری کے حوالے سے زیادہ محتاط ہو جاتی ہے۔

برطانویوں کی بھی پالیسی یہ تھی کہ وہ ان فوجیوں کی دلجوئی کے لیے معاوضے

اور فوائد کی مد میں ان دیہاتی علاقوں کے دیگر باسیوں سے زیادہ مفادات پہنچاتی تھی۔ یہ رسم آج بھی جاری ہے اور پاکستانی فوج اپنے جوانوں کو زیادہ معاوضے اور عالمی معیار کے مطابق دیگر سروسز مہیا کرتی ہے۔ نہ صرف جوانوں کو بلکہ ان کے گھر والوں، سپاہیوں کے والدین اور ریٹائرڈ فوجیوں کو بھی یہ سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ پاکستانیوں کی اکثریت کے لیے فوج کا محکمہ زیادہ پرکشش ہے۔ اور اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ فوج میں کرپشن کے کم سے کم ترغیبات ہوتی ہیں۔ جیسا کہ لاڑکانہ کے ایک صحافی کا کہنا ہے:

''آرمی کے میرے ایک کرنل دوست ہیں جو جلد ہی ریٹائر ہونے والے ہیں۔ انہیں اسلام آباد میں ایک پلاٹ الاٹ کیا جا چکا ہے جس پر وہ چاہیں تو مکان بنالیں یا بیچ کر پیسے بنالیں اور اس کے علاوہ فوجی فاونڈیشن میں انہیں ملازمت بھی دے دی گئی ہے۔ ایسے شخص کو چوری کی کیا ضرورت ہے۔ میرا ایک اور ایس ایس پی دوست بھی ریٹائر ہو رہا ہے۔ اسے کچھ بھی نہیں ملے گا، سوائے معمولی پنشن کے۔ اس لیے اسے اپنے محفوظ مستقبل کے لیے کرپشن کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لیے ایس ایس پی اپنی برادری کے تمام تعلقات کو بھی استعمال میں لائے گا تا کہ اس کی کرپشن کو سیاسی کور مل سکے۔ اس کے بدلے میں یہ پولیس افسر دوسرے قبائل کے مقابلے میں اپنے قبیلے کے لوگوں کو غیر قانونی مدد کرے گا''(6)

فوجی جوانوں کے مفادات اور اعلی معاوضے اس لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں تا کہ فوجی منظّم رہ سکیں اور ایسی صورتوں میں بھی ہائی کمان کے اطاعت گزار رہیں جو ان کے اپنے جذباتی لگاؤ سے متصادم ہوں۔ مثال کے طور پر افغانستان میں امریکی مداخلت میں پاک افواج کی جانب سے امریکہ کی مدد کرنے کا فیصلہ ایسا فیصلہ تھا جو فوجیوں اور ان کے قبائل کے دیگر لوگوں کے نزدیک

پسندیدہ نہیں تھا۔

فوجیوں کے مفادات کی سکیموں کو قائم رکھنا اس لیے بہت ضروری امر ہے، اس احساس یگانگت کو قائم رکھنے میں پیسہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پاکستان کی فوج اس یگانگت کو قائم رکھنے میں اس لیے بھی کامیاب رہی ہے کہ 1947 سے لیکر اب تک انہوں نے ریاستی وسائل کے زیادہ تر حصے کا رخ اپنی طرف رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

یقیناً فوج کو حاصل مراعات اور بجٹ کا زیادہ تر حصہ ان کے لیے مختص کیا جانا، ایک ایسا مظہر ہے جو سماج کے کچھ حصوں میں غیر معروف ہے۔ دو قسم کی مراعات کو خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پہلی شہری علاقوں میں فوجیوں کو زمینوں کی الاٹمنٹ تاکہ ریٹائرمنٹ کی زندگی وہ پرسکون انداز میں گزار سکیں۔ یہ روش برطانوی اقتدار بلکہ مغل دور سے چلی آ رہی ہے۔(7)

لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ تنویر نقوی نے فوجیوں کو زمینیں دینے کا جواز دیتے ہوئے مجھے بتایا تھا:

''سویلین اور خاص طور پر سیاستدانوں اور تاجروں کے مقابلے میں فوجی کافی کفایت شعاری کی زندگی گزارتے ہیں۔ ایک فوجی کا کیریئر دیکھنے میں پرکشش نظر آتا ہے مگر اسے اپنے کیریئر کا اکثر حصہ انتہائی سرد اور انتہائی گرم بیرکوں میں یوں گزارنا پڑتا ہے کہ شاذ ہی اس کا بیوی بچوں سے ملنا ہوتا ہے۔ نجی شعبے میں اب جو تنخواہیں دی جاتی ہیں فوجیوں کی تنخواہیں ان سے کم ہیں اگرچہ ریٹائرمنٹ پر انہیں اچھی خاصی رقم مل جاتی ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ اچھی بات ہے کہ انہیں آسان شرائط پر لمبے عرصے کی حامل مدت میں زمین کا وہ ٹکڑا مل سکے جہاں وہ گھر بنا سکیں۔''(8)

مسئلہ زمینیں دینا نہیں بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ فوج کو پاکستان میں جو طاقت اور

اہمیت حاصل رہی ہے اس کی وجہ سے فوجیوں کو شہر کے نواح میں مفت زمینیں دی گئیں مگر اب یہ زمینیں رئیل سٹیٹ کی دنیا کی مہنگی ترین زمینیں بن چکی ہیں۔ بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق لاہور میں 2000 میں جس پلاٹ کی قیمت 65000 ڈالر تھی 2006 میں اس کی قیمت 15 لاکھ ڈالر تک جا پہنچی ہے۔(9)

لازمی سی بات ہے کہ وہ اعلیٰ فوجی افسران جنہیں یہ پلاٹ سستے داموں خریدنے کی سہولت حاصل ہے اور خاص طور پر اعلیٰ افسران، وہ چار چار پلاٹ خرید لیتے ہیں (پرویز مشرف کے پاس ایسے سات پلاٹس تھے) جنہیں بعدازاں وہ انتہائی بلند مارکیٹ ریٹس پر بیچ کر خوب مال بناتے ہیں۔ یہ سارا کام اگرچہ مکمل طور پر قانونی ہے مگر جو روپے یہ پیدا کر رہا ہے وہ روپے قانونی نہیں ہیں اور خود فوج کے بعض حصوں کی طرف سے اس پر تنقید ہوتی رہی ہے۔(10)

تنقید کا دوسرا پہلو ملٹری کو حاصل انڈسٹریل ہولڈنگز کے حوالے سے ہے جو ریٹائرڈ اور معذور فوجیوں کی دیکھ بھال کے لیے بنائے گئے۔(11) اس طرح کی فوجی فاؤنڈیشنز کی بنیادیں دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ نے معذور ہو جانے والی فوجیوں کے لیے رکھی تھیں۔1953 میں پاکستانی فوج نے اپنے شیئرز کی سرمایہ کاری کمرشل منصوبوں میں شروع کی جس کا مقصد غریب فوجی جوانوں کی مدد کرنا تھا۔ 1967 میں اس نوع کے صنعتی اور فلاحی اداروں کو فوجی فاؤنڈیشن کا نام دیا گیا۔ 2009 تک فوجی فاؤنڈیشن کے صنعتی شعبے کے اثاثے 125 ارب تک پہنچ چکے تھے جبکہ فوجی فاؤنڈیشن کے فلاحی شعبے کے اثاثے 42 ارب روپے تک تھے۔ عام خیال کے برعکس فوجی گروپ کی کمرشل سرگرمیاں ٹیکس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔2005-06 میں اس گروپ نے 32.4 ملین روپے کا ٹیکس دیا تھا۔ تاہم فوجی فاؤنڈیشن کی فلاح سرگرمیاں ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔ فوجی فاؤنڈیشن کا سالانہ بجٹ چار ارب روپے ہے جس کے

تحت سابق فوجیوں، شہیدوں اور معذور ہونے والے فوجیوں کی بچوں، بیواؤں اور والدین کے لیے صحت کی سہولتیں، تعلیم اور پیشہ وارانہ تعلیم کی سہولتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ جو فوجی اس وقت کام کر رہے ہیں ان کی مدد آرمی، نیوی اور فضائیہ کے ویلفیئر ٹرسٹس کرتے ہیں۔ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ کے کل اثاثے 50 ارب روپے ہیں۔ اثاثوں میں 16000 ایکڑ آباد زمین، رائس اور شوگر ملیں، سیمنٹ پلانٹ اور انشورنس کمپنیاں شامل ہیں۔(12)

پاک آرمی اپنے اندرونی نفع کو نہ صرف فوجیوں کے مفادات بلکہ پوری فوج کی بہتری کے لیے ایماندارانہ اور منظم انداز سے تقسیم کرتی ہے۔ یوں ایک حوالے سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فوج قرابت داروں کا ایک ایسا گروہ ہے جو ریاست سے سرپرستی حاصل کرتا ہے اور اپنے ممبران تک مراعات پہنچاتا ہے۔ تاہم فوج یہ کام اس وقت تک یہ کام نہیں کر سکتی جب تک اس میں مضبوط اور توانا اخلاقی قدریں نہ ہوں۔ یہ اخلاقی قدر پاکستانی قومیت ہے، اگرچہ فوج میں بھی خونی رشتہ داریاں ہوتی ہیں، مگر پاکستان آرمی قومیت کی مجسم صورت کی مثال ہے۔(13)

پاکستانی فوج باقی تمام اداروں کے مقابلے میں خود کو ایمان کی حد تک ناگزیر اور اہم ترین ادارہ سمجھتی ہے جو پاکستان کے ساتھ مکمل طور پر وفادار ہے۔ فوج کے ادارے سے باہر پاکستانی قومیت کو کرپٹ ذاتی مفادات، اقربا پروری اور مذہبی وفاداریوں سے آلودہ سمجھا جاتا ہے۔ پاکستان سے وفاداری فوجی، چاہے جوان ہو یا افسر، اس وقت بھر دی جاتی ہے، جیسے ہی وہ فوج میں شمولیت اختیار کرتے ہیں۔ اور پھر بھرپور کوشش کی جاتی ہے کہ یہ خیال آلودہ نہ ہو خاص طور پر جب تک یہ فوجی فوج میں کام کرتے ہیں خفیہ ایجنسیاں اس بات کو یقینی بناتی رہتی ہیں کہ پاکستان سے وفاداری مشکوک نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ جنرل ضیا کے استثنا کے ساتھ فوجی ہائی کمان

کسی بھی قسم کی مذہبی تبلیغ کی بھی حوصلہ شکنی کرتی رہی ہے۔ (جنرل ضیا کے دور میں تبلیغی جماعت کو اجازت تھی کہ وہ فوجیوں کے سامنے خطبے دے سکے، مگر بعد کی فوجی قیادت نے اس رویے کی حوصلہ شکنی کی اور کسی حد تک کامیابی بھی حاصل کی)۔ اسلام سے شدید وفاداری کے باوجود فوج اصولی طور پر سمجھتی ہے کہ مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے اور رہنما آدرش سے زیادہ قومی شناخت کا ایک پہلو ہے۔

یقیناً قوم پرستی بھی اتنی ہی خطرناک ہوسکتی ہے جتنا مذہب۔ اگرچہ یہ بھی سچ ہے کہ ریاست سازی اور معاشی وسماجی ترقی کے حوالے سے دنیا کے کئی حصوں میں قوم پرستی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ عام طور پر قوم پرستی ایک قوم کو مضبوط کرنے اور ذاتی مفادات سے ہٹ کر اجتماعی مفاد کی طرف متوجہ کرنے میں لوگوں کی بڑی تعداد کے لیے ایک موثر اپیل ہوتی ہے۔ اسی طرح قوم پرستی وہ طاقت ہے جو ماڈرنائزیشن کی طرف لے جاتی ہے۔ جبکہ دوسری طرف یہی قوم پرستی قوم کو دشمن ریاست کے خلاف خود کو مضبوط کرنے کی طرف بھی لے جاتی ہے، جس سے وہ جنگیں قوموں کا مقدر بنتی ہیں جو ہلاکت خیزی لاتی ہیں۔

پاکستانی لیڈرز جن میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، ایوب خان اور پرویز مشرف شامل ہیں نے اتاترک ماڈل کو اختیار کیا جن کی سیکولر اور جدید قومیت نے جدید ترکی کی بنیادیں رکھیں۔ ایوب خان اور مشرف کھلے عام کمال ازم کا پرچار کرتے رہے ہیں۔ دونوں ہی مذہبی رجعت پسندی کے خلاف تھے اور دونوں نے ہی پاکستانی سماج، خاص طور پر عورتوں کے حوالے سے موجود رویوں کے سلسلے میں جدیدیت کے لیے کوششیں کیں۔ (14) اگرچہ فوج کے آفیسرز کی فہرست میں کچھ لوئر مڈل کلاس رجعت پسند حلقے پیدا ہوئے تاہم سماجی جدت سے فوج کی وابستگی کسی نہ کسی حد تک قائم رہی ہے۔ ویسے بھی موثر مسلح افواج کو قائم رکھنے کے لیے کسی حد تک ماڈرن

خیالات اور رویوں کو تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔

بلوچ قبائل اور پشتون بیلٹ میں انتہائی رجعت پسند طالبان پشتونوں کے خلاف لڑائی کے حوالے سے فوج نے کسی حد تک سماجی ارتقا اور جدیدیت کی نمائندگی کی۔ اس حقیقت کا ادراک مجھے 2011 میں اس وقت شدت سے ہوا جب میں ضلع سوات کے دورے پر گیا۔ یہ علاقہ 2009 تک طالبان کے قابو میں تھا۔ جب فوجی کارروائی کے نتیجے میں وہاں سے طالبان کو نکال دیا گیا تو میں نے ایک ایسے قید خانے کا دورہ کیا جہاں طالبان کے چھوٹے درجے کے ممبران قید تھے وہاں میں نے دیکھا کہ فوج کیسے ری ہیبیلیٹیشن سنٹرز میں جدید پاکستانی مسلم قومیت کے لیے تعلیم اور لٹریچر استعمال کر رہی تھی۔

اور طالبان کے سابق مضبوط قلعے مٹہ کے دورے کے دوران تو میں نے عورتوں کا ووکیشنل ٹریننگ سنٹر بھی دیکھا۔ جہاں مقامی عورتوں کو دستکاریاں، سلائی کڑھائی سکھائی جا رہی تھی اور ان کی بنائی چیزوں کو ملک کے مختلف شہروں میں مارکیٹ کرنے میں مدد کی جا رہی تھی جسکا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف معاشی طور پر آزاد ہوں بلکہ شدت پسندی کے خلاف خاندانوں پر بھی اثر انداز ہوں۔ ہفتے میں دو روز یہاں فوج کی خاتون ڈاکٹر ان عورتوں اور ان کے بچوں کا معائنہ کرتی تھی۔ ادارے کی دیواروں پر آرمی ملبوس پہنی خواتین کی تصاویر تھیں تاکہ یہ خواتین متاثر ہوں۔

تاہم بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستانی افواج کو جدید قومی حکمت عملی پر عمل پیرا رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے جیسا کہ ایوب اور مشرف کی ناکامی سے اس کا اظہار ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے فوج کو اپنی قومیت کا واضح احساس ہونا ضروری ہے تاکہ عام عوام میں اس کا اعادہ ہو سکے کیونکہ عام پاکستانی سماج لسانی اور آئیڈیالوجیکل خلفشار کا شکار ہے اور اس احساس کے پھیلنے میں مزاحم ہے۔ پاکستانی فوج کی تشکیل میں محدود نسلی

دائرہ جہاں آرمی میں نسلی بنیادوں پر تقسیم کو روکنے کے حوالے سے اہم ہے وہیں شمالی پنجاب کے علاقوں پر مشتمل آرمی ممکنہ طور پر سندھیوں بلوچیوں اور خود جنوبی پنجاب کے لوگوں کو موبلائز نہیں کرسکتی کہ وہ ملک کے استحکام کے لیے اپنے اشرافیہ کے خلاف بغاوت کرسکیں۔ اتاترک کے برعکس جنہیں آبادی کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی، پاکستان میں اس طرح کی وحدت نہیں ہے نہ ہی یہ چیز پیدا کرسکتا ہے۔

کمال ازم کے برعکس پاکستان میں قوم پرستی پاکستان میں انقلاب لانے کے لیے موزوں ہونے کی بجائے الٹا خطرناک ہے۔ ترکی کو جدیدیت کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے اتاترک نے صرف قوم پرستی کو استعمال نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پیچھے اس کی فوجی فتوحات بھی تھیں، ترکی نے فرانس، آرمینیا اور یونان کو ہی شکست نہ دی تھی بلکہ اس نے برطانیہ سے بھی جھگڑا مول لیا تھا اور تمام غیر ترکوں کو اناطولیہ سے نکال دیا تھا۔ یہ طاقتیں جنہیں کمال اتاترک نے شکست دی تھی دوسری جنگِ عظیم کے بعد اضمحلال کا شکار تھیں جبکہ پاکستانی قومیت کی بنیادیں، خاص طور پر آرمی کے نقطہ نظر سے، بھارت دشمنی پر ہیں، جس کی آبادی پاکستان سے چھ گنا اور معیشت دس گنا زیادہ توانا ہے۔(15) (گذشتہ ایک دہائی میں امریکہ بھی کئی حوالوں سے پاکستان مخالف ہو چکا ہے۔ بھارت کی طرف جھکاؤ اور افغانستان میں امریکی فوج کی موجودگی کو اکثر پاکستانی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور پاکستان کی سکیورٹی انتظامیہ کو مستقبل میں افغانستان میں بھارت کے غلبے کا خطرہ ہے)۔ امریکہ ایک طرف، بہرحال بھارت پاکستان کی طاقت سے کہیں بڑا دشمن ہے۔ ایوب کے دور کی خوشحالی جا چکی ہے اور جدیدیت کا اس کا پروگرام بھی بکھر چکا ہے۔ 65اور71 کی جنگ میں ناکامی کے بعد پاکستانی آرمی اس جھٹکے سے جانبر نہیں ہوسکی۔ 1999 کی کارگل کی مہم جوئی اور ممبئی کے 2008 کے حملوں کے حوالے سے امریکہ اور باقی دنیا کا جو ردعمل آیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے

کہ بھارت کی اپنی طاقت ایک طرف، عالمی برادری کسی ایٹمی طاقت پر پاکستان کے حملے کو برداشت نہیں کرے گی۔ پاکستان کی فوج کو امید ہے کہ مستقبل میں چین کی بڑھتی ہوئی طاقت، بھارت اور امریکہ کے مقابلے میں اس کی کمزور پوزیشن کو متوازن کردے گی مگر اس وقت تک اس سلسلے میں چین کی بڑی محتاط پالیسی ہے۔ اس اثنا میں فوج کے بھارت مخالف تذویراتی تخمینے جو افغانستان سے متعلق ہیں، ان کے حوالے سے بھی پاکستان آرمی کا امریکہ سے تصادم ہے۔

یوں اگرچہ پاکستانی فوج پاکستان کا وجود برقرار رکھ سکتی ہے مگر یہ اتنی مضبوط نہیں ہے کہ ملک کو جدید اور کامیاب ریاست میں بدل سکے۔ مسلح افواج کی مملوک طرز، اس کو انتشار سے بچانے میں اہم کردار رکھتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کے برخلاف ملک کو متحد کر سکے۔ دوسری طرف وہ قومیت جس پر فوج اپنے مورال کے حوالے سے انحصار کرتی ہے، اس سے اسے عالمی مخالفت کا سامنا ہو سکتا ہے اور افغان طالبان اور لشکر طیبہ جیسے شدت پسند گروہوں سے اس کے مراسم خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اگر اب پاکستان کی سرزمین سے کسی دہشت گرد گروپ کا امریکہ میں کامیاب حملہ ہوتا ہے تو امریکہ کا بدلہ پاکستان اور اس کی فوج کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔

پاکستان میں فوج کو حاصل استثنا

1947 سے آزادی کے بعد پاکستان میں فوج نے تین بار براہ راست حکومت کی ہے تو باقی کے عرصے میں جب وہ براہ راست اقتدار میں نہیں رہی تو سیاست پر ان کا اثر ورسوخ قائم رہا۔ پاکستان میں فوج کے غلبے کی روایت کی بنیادیں اولا اس حقیقت میں پیوست ہیں کہ یہ ملک کا واحد ادارہ ہے جو وہی کام کرتا ہے جو اسے کرنا چاہیے، یا جیسے جدید ریاستی اداروں میں اس کا معیار ہونا چاہیے۔ اس بنیاد پر پاکستانی عوام کی ایک معتد بہ تعداد کا خیال ہے کہ جس طرح اندرونی طور پر فوج نے موثر ادارے کے طور پر اپنی پہچان بنائی ہے، اس دائرے کو فوجی حکومت کے ذریعے پوری ریاست تک توسیع دی جاسکتی ہے۔ تاہم یہ خیال ایک غلطی ہے۔ ہر بار جب فوج نے ملکی انتظام کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے تو اس میں فوراً ہی یہ احساس پیدا ہوا ہے کہ ریاست اتنی کمزور ہے کہ اس کے پاس کوئی اور آپشن ہی نہیں سوائے اس کے کہ انہی پرانے مقامی اشرافیہ کے ساتھ مل کر کام کرے اور سر پرستی، کرپشن اور اقربا پروری کی زمین میں گڑے تعلقات کی بنیاد پر وہی پرانے طریقے استعمال میں لائے۔

بلاشبہ اپنے دائرہ کار میں فوج متاثر کن کارکردگی کی حامل رہی ہے۔ اس کی

ایک وجہ یہ ہے کہ فوج واحد ریاستی ادارہ ہے جس نے پاکستانی قومیت کے جدید تصور کو قبول کیا ہے۔اس کی دوسری اور متعلقہ وجہ اس قدیم سوال کے جواب سے جڑی ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جہاں لسان و نسل کی بنیاد پر تقسیمیں ہوں اور جہاں وفاداریاں اور عداوتیں اقربا پروری پر تعمیر ہوں ، وہاں کیسے ایسی فوج تشکیل دی جائے جس میں معاشرے کی یہ خرابیاں نہ ہوں تا کہ ملک کو نا مختتم خانہ جنگیوں سے بچایا جا سکے۔

مملوک نمونہ

اپنے قیام کے پہلے سال سے ہی فوج کی ہائی کمان کو یہ خوف لاحق رہا کہ پاکستانی سیاست میں موجود گروہ بندیوں کا دائرہ کہیں فوج تک نہ پھیل جائے اور فوج بھی نسلی، سیاسی، ذاتی یا قبائلی خطوط پر تقسیم نہ ہو جائے۔ یہ وہ وجہ رہی ہے کہ فوج نے منتخب وزرائے اعظم کی فوج میں پروموشنز کے معاملات میں مداخلت کے خلاف ہمیشہ مزاحمت کی۔ یہ معاملہ کئی بار فوجی حکومتوں کے آنے یا کم سے کم مارشل کے خطرات کا سبب بنا۔جیسا کہ آئی ایس آئی کے ایک سینئیر اہلکار نے 2009 میں اپنے ایک انٹرویو کے دوران مجھے بتایا کہ ”برطانوی دورحکومت میں فوج کو سماج سے علیحدہ بیرکوں تک محدود رکھا جاتا تھا۔وہ ایک بہتر ماڈل تھا کیونکہ پاکستان میں یہ مستقل خطرہ موجود ہے کہ فوج کو سیاست زدہ اور کرپٹ کیا جا سکتا ہے۔ہمیں ہمیشہ یہ شدید خطرہ رہتا ہے اور ہم بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ خود کو علیحدہ رکھیں......فوجی پروموشنز اور تعیناتیوں کے عمل میں سیاستدانوں کی مداخلت کے حوالے سے ہم ہمیشہ چوکس رہتے ہیں کیونکہ اس سے فوج میں انتشار پھیل سکتا ہے اور اگر فوج میں انتشار پھیلا تو ملک تباہ ہو جائے گا۔ آپ خود دیکھیں کہ نواز شریف کے گذشتہ دور حکومت میں کیا ہوا تھا۔اس وقت کے آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت نے نواز شریف کے بہت سے مطالبات مان لیے

مگر آخر کار فوج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ جب کبھی سویلین حکومت نے اس ادارے میں مداخلت کی تو ہمیں اپنے دفاع کے لیے اقدامات کرنا پڑے۔"(16)

ماضی اور موجود دور کی مطلق العنان حکومتوں نے فوج کی وحدت کو قائم رکھنے کے حوالے سے یہ قدم اٹھایا جاتا رہا ہے کہ فوجی بھرتیوں کو مطلق العنان حکمران کے قبیلے تک محدود رکھا جاتا تھا۔ یہ اپروچ آج بھی مشرق وسطی میں مستعمل ہے۔ جیسا کہ عراقی آمر صدام حسین نے اپنی فوج کو تکریتی قبائل تک محدود رکھا، اسی طرح شام کی اسد حکومت نے علویوں تک فوجی بھرتیوں کو محدود رکھا (یاد رہے کہ علوی اگرچہ ایک مذہبی گروہ ہے مگر اس میں قبائلی خصوصیات پیدا ہو چکی ہیں)۔ لیبیا میں کرنل معمر قدافی نے بھی فوج اپنے قبیلے سے بنائی۔ مگر اس حکمت عملی کے دو بنیادی نقصان دہ پہلو تھے۔ ایک تو ایک قبیلے تک محدود ہونے کی وجہ سے ایسی فوج اندرونی طور پر تو موثر ثابت ہو سکتی ہے مگر طاقت ور دشمن کے خلاف یہ مختصر فوج بیکار ثابت ہوتی ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ دوسرے قبائل اس قبیلے سے نفرت کرتے ہیں اور جمع ہو کر اس کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد فوج میں وحدت کے مسئلے کے حل کے لیے خواجہ سراؤں کی فوج بنانے کا خیال آیا جن کی وفاداریوں کی بنیادیں اقربا پروری پر تعمیر نہیں ہوتیں۔ متعدد ریاستوں نے تاریخ میں اس حل کو آزمانے کی بھی کوشش کی۔ مگر کچھ وجوہات کی بنیاد پر (اگرچہ بازنطینی خواجہ سرا جنرل نارسس کا ریکارڈ بہترین رہا) یہ اپروچ فوجوں کی تشکیل کے حوالے سے زیادہ کامیاب ثابت نہ ہو سکی۔

رشتے داریوں کی بنیاد پر فوج میں انتشار کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے دور وسطی اور جدید دور کے ابتدائی زمانے میں مسلمان شہنشاہوں نے جو حل نکالا وہ ایک طرف کامیاب بھی ثابت ہوا اور تباہ کن بھی۔ انہوں نے سماج کے نمایاں قبائل سے

باہر کی فوج بنائی۔ مشرق وسطی اور جنوبی ایشیا کے مسلمان حکمرانوں نے ترک جنگی قیدیوں پر مبنی فوجیں تشکیل دیں۔ ان فوجیوں کو مملکوک یعنی غلام کہا جاتا تھا(1206 سے 1290 تک ہندوستان پر حکومت کرنے والے یہی لوگ تھے اس لیے ان کے دور حکومت کو سلطنت غلاماں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔)

اپنے قیام کے ابتدائی زمانوں میں یہ مملوک فوج انتہائی کامیاب رہی جس نے نہ صرف صلیبی جنگوں میں نمایاں کارکردگی دکھائی بلکہ منگول خطرے کا بھی کامیاب دفاع کیا۔ دوسری طرف انہوں نے عرب شہنشاہوں کے تختے بھی الٹے اور اقتدار پر قبضے بھی کیے۔ شاید اسی تاریخ کے پیش نظر عثمانی ترکوں نے ایک مختلف اپروچ اختیار کی۔ انہوں نے سلطنت میں موجود عیسائی اقلیتوں کے کم سن لڑکے لیے جن کے ترک قبائل کے ساتھ کسی قسم کے رشتے نہیں تھے، انہیں اسلام میں داخل کیا اور ان کی فوج تشکیل دی۔ ان لڑکوں پر مشتمل فوج کو ینگ سری کہا گیا۔ اپنے پس منظر کی وجہ سے ان ینگ سریوں نے اقتدار پر قبضے تو نہ کیے مگر یہ ریاست کے اندر اتنے طاقتور اور ہٹ دھرم ہو گئے کہ 1826 میں ایک اصلاح پسند عثمانی سلطان محمود دوئم نے اس فوج کو توڑ دینے اور ینگ سریوں کا قتل عام کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔(17)

جہاں تک تعلق ہے پاکستانی فوج کا تو، پاکستانی فوجی کسی مطلق العنان شہنشاہ کے خدمت گزار نہیں ہیں، نہ ہی یہ مملوک ہیں اور نہ ہی ینگ سری۔ تاہم ان میں ان کا نظم وضبط، اتحاد اور موثریت موجود ہے، جس کی بڑی وجہ ایک تو یہ ہے کہ یہ عام سوسائٹی سے کسی حد تک علیحدہ ہوتے ہیں اس لیے یہ اس اقربا پرور کلچر سے کسی حد تک دور ہیں جو پاکستان کے سیاسی نظام میں گہری جڑیں پکڑ چکا ہے جس کی وجہ سے سیاسی سرپرستی کا نظام اتنا محکم ہو چکا ہے کہ یہ رویہ باقی ریاست میں بھی رواج پا چکا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ فوج میں میرٹ کے اصول رائج ہیں اور اندرونی طور پر فوج

کرپشن فری ادارہ کہا جا سکتا ہے، مکمل طور پر نہ سہی تو سول سروس کے مقابلے میں یہاں کرپشن بہت ہی کم ہے۔ پولیس عدلیہ اور سیاست دانوں کے مقابلے میں دیکھیں تو فوج کو واقعی کرپشن فری ادارہ کہا جا سکتا ہے۔

پاکستان کی سیاست میں دولت، پیدائش اور رشتہ داریاں غالب کردار ادا کرتی ہیں جبکہ فوج میں، جیسا کہ مجھے ایک فوجی اہلکار نے بتایا:

''یہاں ترقی کی بنیاد میرٹ ہے، نہ کہ وراثت، یہاں سلیوٹ کندھے پر لگے بیجز کو کیا جاتا ہے نا کہ کسی سردار یا پیر کو جو وراثت میں یہ مقام پاتا ہے، اس وقت بھی آرمی میں متعدد ایسے جرنل ہیں جو کسی معمولی کلرک یا دکانداروں کے بیٹے ہیں اور کئی ایسے بھی ہیں جو فوجی خاندانوں سے ہیں مگر معمولی حوالداروں کی اولاد ہیں۔ یہ باتیں فوج میں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں اس لیے یہ لوگ جرنل ہیں'' (18)

بلکہ جس وقت یہ مضمون لکھا جا رہا ہے اس وقت بھی آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی ہیں جو ایک نان کمشنڈ فوجی جوان کے بیٹے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف پاکستان کی سیاسی جماعتوں اور سیاسی گروہوں کو دیکھیں تو ان کی قیادت نسلی جاگیرداروں، اور سرمایہ داروں کے پاس ہے سوائے جماعت اسلامی اور ایم کیو ایم کی قیادت کے۔

پشتونوں کے خلاف ہماری جنگ

افغانستان کی موجودہ صورت حال کو دیکھ کر مجھے وہ پرانا روسی لطیفہ یاد آتا ہے جو ایک امید پرست اور مایوس انسان کے حوالے سے خاصا مشہور ہے۔ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ ایک امید پرست انسان کہتا ہے ''حالات جتنے خراب ہو چکے ہیں، اس سے زیادہ مزید خراب کیا ہوں گے'' جبکہ مایوس انسان کہتا ہے ''نہیں، ابھی حالات اور بھی خراب ہوں گے''۔ یہ لطیفہ مجھے اس وقت یاد آیا جب ایک اور دوست کو میں نے یہ کہتے سنا کہ امریکہ اور نیٹو افواج کے افغانستان سے انخلا کے بعد ملک ایک بار پھر خانہ جنگی کا شکار ہو جائیگا۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ جو لوگ یہ بات کر رہے ہیں وہ اس صورت حال کو کیا نام دیتے ہیں جو فی الوقت طالبان اور افغان سکیورٹی فورسز کے درمیان جاری ہے؟

طالبان اور مغربی طاقتوں کے درمیان جاری حالیہ کشاکش بھی درحقیقت خانہ جنگی ہی ہے۔ یہ خانہ جنگی دراصل اس جنگ کا تسلسل ہے جو 1992 سے مجاہدین کے مختلف گروہوں کے درمیان جاری ہے، اس وقت سے جب افغانوں نے روس کی اشتراکی حکومت کو ملک سے نکالا تھا۔ اور یہ خانہ جنگی بھی بالکل ویسی ہی ہے جیسے 14 سال قبل کمیونسٹوں اور ان کے مخالفین کے درمیان جاری تھی۔ جو 1979 میں ہوا اور

بعدازاں 2001 میں ہوا وہ یہ تھا کہ ایک سپر پاور نے افغان خانہ جنگی میں کسی ایک فریق کا ساتھ دینے کے ارادے سے مداخلت کی تھی۔ اس مداخلت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اندرونی خانہ جنگی میں جس فریق کا بیرونی قوت نے ساتھ دیا طاقت کا توازن کچھ دیر کے لیے اس کے حق میں ہو گیا۔

کنگز کالج کے میرے کچھ طلبا نے اس سال اپنے ایم اے کا تھیسس ایڈورڈ لٹوک کی اس دلیل پر لکھنے کا انتخاب کیا جو اس نے 'جنگ کو ایک موقع دیں' نامی مضمون میں انسانی بنیادوں پر مداخلت کے حق میں دی تھی۔ ایڈورڈ کے اس تھیسس نے مجھے اکسایا کہ اس کے دلائل کو افغانستان کے ان حالات کی روشنی میں دیکھوں جس کا ملک کی پچھلی دونسلوں کو سابقہ ہے۔ میرے اس مضمون کا قطعی طور پر یہ مطلب نہیں ہے کہ میں افغانستان کے حوالے سے امریکی حکمت عملی کی تائید کروں۔ نہ ہی 1979 کی روسی یا 2001 کی امریکی مداخلت کو انسانی بنیادوں پر کی گئی مداخلت قرار دوں۔ ان دونوں مداخلتوں کی کوشش یہی تھی کہ افغانستان میں جاری اسلام پسندوں اور رجعت پسندوں کی مزاحمت کے مقابلے میں جو جدید ترقی ہوئی اس کو برقرار رکھا جائے اور اس میں توسیع کی جائے۔

دوسری طرف اگرچہ لٹوک کے زیادہ تر دلائل کراہت انگیز ہیں تاہم اس کی ایک بات میں وزن ہے کہ اس طرح کی مداخلت سے طاقت کا توازن کسی ایک فریق کے حق میں کر کے طاقت کی مقامی حقیقتوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ حقیقت پسندانہ نقطہ نظر سے دیکھیں یہ ایک غیر متعلق بات ہے کیونکہ جتنا عرصہ تک بیرونی مداخلت رہتی ہے طاقت کا توازن کسی ایک فریق کے حق میں رہتا ہے۔ اور یہ وہ تاریخی حقیقت ہے جو استعماری طاقتوں کے حوالے سے مبرہن ہے کیونکہ یہ استعماری طاقتیں اپنے مقامی اتحادیوں کے ایما پر تاریخ میں ہمیشہ مداخلت کرتی رہی ہیں۔

یہی کچھ نیٹو نے بوسنیائی مسلمانوں اور بلقان میں کوسووو البانینز کے لیے کیا تھا۔ مسلمانوں اور البانینز کے طاقتور سربوں کو یورپی یونین کی مدد سے نیٹو نے شکست دے کر بلقان میں جو طاقت کا توازن تخلیق کیا وہ اس علاقے کے حقیقی طاقت کے توازن کا عکاس نہیں تھا۔ افغانستان کو سامنے رکھ کر دیکھیں تو یہاں یہ واضح فرق ہے کہ بوسنیا، سربیا اور کوسووو براعظم یورپ میں ہیں جہاں نیٹو کی حقیقی طاقت ہے، اس لیے اس اتحاد نے یہاں اس طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے کے حوالے سے غیر معمولی عزم کو قائم رکھا کیونکہ اگر اس خطے میں نوے کی دہائی کی قتل و غارت کا احیا ہوتا تو یہ ان کے ضمیر اور عزت کے لیے ایک دھچکا ہوتا۔ دوسری بات یہ اس حوالے سے یورپی یونین اور نیٹو کا جو پرعزم موقف تھا اسے وہاں کے عوام کی حمایت بھی حاصل تھی۔ مگر جہاں افغانستان کا معاملہ ہے تو نہ ہی نیٹو اور نہ ہی یورپی عوام کی کمٹمنٹ میں وہ گہرائی نظر آتی ہے۔ ان کا سیدھا سادہ موقف یہ ہے کہ ہم بڑی طاقت کے ساتھ افغانستان میں کسی فریق کے حق میں طاقت کا توازن رکھ سکتے ہیں جو طویل المدتی نہیں ہوسکتا، اگر کم طاقت کے ساتھ وہاں موجود رہا جائے تو یہ خود نیٹو کے لیے تباہ کن نتائج کا سبب بن سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ افغانوں کی اکثریت پشتون ہے۔ 2001 میں افغانستان میں امریکی مداخلت کی وجوہات کچھ بھی رہی ہوں یہ بات حتمی ہے کہ امریکی مداخلت کا افغان خانہ جنگی پر یہ اثر پڑا کہ فوجی طاقت کا توازن پشتون رجعت پسند اکثریت کے خلاف اور غیر پشتون اور لبرل و شہری اینٹی طالبان پشتونوں کی اقلیت کے حق میں ہوگیا۔

بدقسمتی یہ ہے کہ پشتونوں کی اکثریت آج بھی دیہی افغانستان میں رہتی ہے یا حال ہی میں شہروں کی طرف ہجرت کر کے آئی ہے جن کا شہری معاشروں کی طرف رویہ زیادہ وسیع نہیں ہے۔ اور یہ بھی ایک المیہ ہے کہ پشتونوں میں کوئی ایسی لبرل

تحریک نہیں اٹھی جو جمہوری انداز میں اصلاحات کے لیے کوششیں کرتی یا پشتون نوجوان نسل کو اس مقصد کے لیے اٹھاتی کہ وہ لبرل اصلاحات کے لیے اس طرح لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے جس طرح وہ طالبان کے لیے تیار رہتے ہیں۔

معاملہ کوئی بھی ہو یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ پشتون افغان صرف طالبان کے لیے نہیں لڑ رہے بلکہ طالبان کے ساتھ وہ اپنے ملک اور عزت کے دفاع کے لیے ہیں یا پھر اپنے ان قریبی عزیزوں کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ان کے ساتھ ہیں جو مغربی افواج کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ بظاہر یوں لگتا ہے کہ امریکی اور شمالی اتحاد کو کامیابی ملی ہے مگر یہ پائیدار نہیں ہے، اس کی وجہ صرف یہ نہیں کہ ملک میں پشتونوں کی اکثریت ہے بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ نیٹو اور امریکی فورسز کی موجودگی نے بذات خود افغانستان میں مزاحمت کو توانائی دی۔

مغرب کی پالیسیوں اور رویوں کے تباہ کن پہلوؤں اور کابل میں کرزائی کی بے تکی حکومت کے علی الرغم، نیٹو اور امریکی فورسز کے افغانستان پر قبضے نے پشتون کلچر کے مفروضے کو زیادہ توانا کیا، وہ پشتون کلچر جس کے بارے میں پاکستان کی سیکولر اور اینٹی طالبان پشتون جماعت اے این پی کے ایک حامی کا کہنا ہے کہ ہر پشتون کی گھٹی میں یہ چیز موجود ہے کہ وہ بیرونی حملہ آووروں کے خلاف مزاحمت کرے۔ کولمبیا یونیورسٹی سے حالیہ دنوں میں شائع ہونے والی کتاب 'طالبان کی شاعری' میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح طالبان نے امریکی اور اتحادی افواج کے خلاف لوگوں کو جمع کرنے کے لیے پشتون کلچر کو استعمال کیا۔

طالبان نے لوک شاعری، لوک کہانیوں حتی کے لوک گیتوں کو استعمال کر کے اپنے پیغام کو ملک کی دیہی پشتون آبادی میں پھیلایا۔ اس کے علاوہ ان خطیبوں کے ذریعے جو طالبان سے ہمدردی رکھتے تھے بھی اپنا پیغام جمعہ کے خطبات کے

ذریعے پھیلایا۔ اس سلسلے میں انٹرنیٹ کو بھی استعمال کیا گیا تاکہ اگر کوئی طالبان کے پیغام کے حوالے سے نرم گوشہ رکھتا ہو تو اس کو بھی متاثر کیا جا سکے۔

افغانستان میں پشتون آبادی کی تعداد 40 فیصد ہے (اگرچہ خود پشتونوں کے مطابق وہ ملکی آبادی کا 70 فیصد بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں)۔ پشتونوں کے بعد دوسرا بڑا نسلی گروہ تاجک ہیں۔ ایک اور اہم حقیقت یہ ہے کہ پشتونوں کی عالمی آبادی کی اکثریت افغانی نہیں ہے بلکہ ہمسایہ ملک پاکستان میں بھی ان کی آبادی دو کروڑ سے زیادہ ہے۔ برطانیہ کی طرف سے کھینچا گیا بارڈر ڈیورنڈ لائن دونوں ملکوں کے پشتونوں کی راہ میں حائل نہیں ہوتا جس کی گذشتہ چالیس سال کی تاریخ پر ایک تباہ کن اثر پڑا ہے۔ (یہ اور بات کہ اسی کی دہائی میں مغربی طاقتیں اس بات کی قائل تھیں کہ اس طرح کا بارڈر مفید ہے کیونکہ سوویتوں کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کو بارڈر کی پاکستانی طرف میں پناہ مل جاتی تھی، جیسا کہ بعد میں طالبان کے کیس میں بھی ہوا)۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں افغانستان میں اینٹی پاکستان حکومتیں نہ آجائیں متواتر پاکستانی حکومتوں کو اس بات کا یقین رہا ہے کہ افغانستان میں دوست حکومت ہونی چاہیے۔ ان حکومتوں کو یہ بھی یقین تھا کہ ایسا صرف افغان پشتونوں کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں پاکستان میں یہ خیال بھی ابھرا کہ افغان پشتونوں پر صرف پاکستان کی اسلامی قوتیں اثر انداز ہو سکتی ہیں کیونکہ وہاں کی اکثریتی پشتون آبادی رجعت پسند ہے جس نے اسلام کے نام پر حملہ آور ہونے والوں کو بھی پشتون کلچر کی روایات کے مطابق رد کیا تھا۔

اس بیانیے کا اطلاق پاکستانی حکمران جنرل ضیاالحق پر اکثر کیا جاتا ہے جو 1977 سے 1988 تک ملک کے حکمران رہے اور جن کی اپنی ہمدردیاں اسلام پسندوں کے ساتھ تھیں۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ نوے اور اسی کی دہائی کے پاکستانی

تجزیہ نگار جو اسلام پسند نہیں بھی تھے وہ بھی اس خیال سے متفق نظر آتے ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ افغان طالبان کی حمایت کا فیصلہ جس پاکستانی حکومت نے کیا تھا وہ بے نظیر کی حکومت تھی جو اس مفروضے پر کیا گیا فیصلہ تھا کہ افغانستان میں رجعت پسند پشتون زیادہ مضبوط ہیں۔ اسی اور نوے کی دہائی میں پاکستان کے فوجی قائدین اس بات پر قائل تھے کہ کہ صرف شدت پسند اسلامی ہی وہ لوگ ہیں جو تندہی سے لڑ سکتے ہیں۔ اس مفروضے کے کچھ حصے ایسے تھے جن کی امریکی سی آئی اے بھی ہم نوا تھی۔

یہ کہا جاتا ہے کہ اسی کی دہائی میں امریکہ کو ماڈریٹ مجاہدین گروہوں جیسے پیر احمد گیلانی اور پیر صبغت اللہ مجددی کی سرپرستی کرنی چاہیے اور پاکستان کو بھی ایسا کرنے پر مجبور کرنا چاہیے تھا۔ اور ریگن انتظامیہ نے ایسا نہ کیا تو اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ امریکی صحافیوں اور دیگر تجزیہ کاروں نے اسے یہ بتایا تھا کہ یہ گروہ صرف چھپنے کے ماہر ہیں۔ میں نے 1989 میں ان گروہوں میں سے ایک لیڈر کا انٹرویو کیا تھا جو اب کرزائی حکومت میں اہم فوجی پوزیشن پر براجمان ہے جس کے پاس واحد جنگی حکمت عملی یہ تھی کہ وہ اچھی طرح خود کو کیموفلاج کر سکتا تھا۔ گذشتہ کئی سالوں سے یہ تاثر مستحکم ہوا ہے کہ اسی کی دہائی میں مجاہدین کو سپورٹ کرنے کا امریکی فیصلہ انتہائی تباہ کن ثابت ہوا ہے۔ مگر اخلاقی اور تذویراتی سطح پر اگر اس فیصلے کو جواز دیا جا سکتا ہے (جیسا کہ میں نے بھی اس وقت اس کے حق میں دلیل دی تھی، جس پر بعد میں پچھتاتا بھی رہا ہوں) تو یہ ہے کہ اس وقت ایسے گروہوں کی مدد کرنے کا فیصلہ معقول تھا جو شدت سے لڑ سکتے تھے۔

2001 اور 2002 میں امریکی سرکردگی میں نیٹو افواج نے طالبان کے مقابلے میں سابقہ مجاہدین گروہ میں سے متبادل پشتون متبادل تخلیق کرنے کی کوششیں کی جو ناکام رہیں کیونکہ ان کی اکثریت نے اشتراکیت کے انہدام کے بعد افغانستان

پر حکومت کے دوران ظلم و تعدی سے اور اغو برائے تاوان جیسے کاموں کی وجہ سے خود کو بدنام کر لیا تھا یا خود کو طالبان سے منتھی کر لیا تھا جو بعد میں امریکی حملوں میں مارے گئے۔ پشتون مجاہدین کمانڈر میں بہترین انتخاب عبدالحق ہوسکتا تھا جو بعد میں طالبان کے خلاف لڑا بھی، اور جسے پچھلے سال شائع ہونے والی لوسی مارگن کی کتاب میں افغان مسئلے کا حل کہا گیا تھا، کو اکتوبر 2001 میں طالبان کو کمزور کرنے کے حوالے سے کیے گئے ایک غیر سنجیدہ آپریشن میں مار دیا گیا تھا۔

جہاں تک پاکستانی پشتونوں کا تعلق ہے تو یہاں کا عام پاکستانی اسلامی جماعتوں کا زیادہ حامی نہیں ہے اگر چہ پشتون علاقوں میں اسلامی جماعتوں کو ملک کے باقی علاقوں کی نسبت زیادہ حمایت حاصل ہے۔ نہ ہی یہ پاکستانی پشتون چاہتے ہیں کہ افغانی طالبان کی طرز پر یہاں کوئی حکومت قائم ہو۔ تاہم افغانستان میں دوسرے نسلی گروہوں کے ساتھ تنازعے کی صورت میں پاکستانی پشتونوں کی ہمدردیاں افغان پشتونوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اور جو سب سے خطرناک بات یہ ہے کہ انہوں نے افغانی طالبان کی تحریک مزاحمت کے لیے دفاعی جہاد کے تصور کو قبول کر لیا ہے۔ جتنے بھی پاکستانی پشتونوں سے میں نے بات کی ہے وہ پاکستان کے افغانی طالبان کے خلاف ایکشن کے حق میں نہیں ہیں اور نہ ہی پاکستانی طالبان کے خلاف آپریشن کے حق میں ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ افغانستان کی قومیت کے لیے جائز جنگ لڑ رہے ہیں۔

اب جو موجودہ صورت حال ہے اس میں مجھے افغان مسئلے کا ایک ہی حل نظر آتا ہے کہ امریکہ پہلے مختلف گروہوں اور افغان نسلوں کے درمیان مفاہمت اور پرامن طور پر معاملات طے کرنے کے عمل کو فروغ دے اور اس کے بعد وہاں سے چلا جائے تا کہ بیرونی قبضے کے جس پس منظر میں طالبان پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اس پروپیگنڈے

کی اخلاقی بنیادیں ختم ہوسکیں۔اس کے لیے پہلا اہم قدم یہ ہے کہ طاقت کی مرکزیت کا خاتمہ کیا جائے کیونکہ میرا نہیں خیال کہ طالبان اور سابقہ شمالی اتحاد کو کابل حکومت میں طاقت میں حقیقی ساجھے داری حاصل ہے۔ جہاں تک اس تجویز کے دوسرے حصے کا تعلق ہے تو اس حوالے سے یہ دیکھا جانا چاہیے کہ خود امریکی افواج کی افغانستان میں موجودگی اور اقدامات نے طالبان کی حمایت میں توسیع میں کتنا کردار ادا کیا ہے۔اس حوالے سے اگر کوئی شکوک موجود بھی تھی تو قرآن جلانے اور سرجنٹ رابرٹ بیلز کے قندھار کے قتل عام کے واقعات کے بعد اب مکمل طور پر ختم ہو چکے ہیں۔

ان واقعات کے بعد افغان فوجیوں اور پولیس والوں کی طرف سے جس طرح امریکی اور نیٹو فوجیوں کو قتل کیا گیا وہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ امریکہ کو خود اپنے سپاہیوں کے تحفظ کی خاطر افغانستان سے نکل جانا چاہیے۔ افغان نیشنل آرمی میں ہزاروں امریکی فوجی مشیروں کی تعیناتی جو 2014 میں امریکی اور نیٹو افواج کے انخلا کے بعد تعینات رہیں گے اس منصوبے کا حصہ ہے کہ کہیں ویتنام کی طرح یہاں بھی امریکیوں کے جانے کے بعد امریکی سرپرستی میں بنائی گئی افغان حکومت کا خاتمہ نہ ہو جائے۔اس منصوبے کا سقم یہ ہے کہ گیارہ سال قبل جو جنوبی ویتنام میں ہوا اس طرح کے خطرات کا اعادہ نہ ہو جائے۔

اس سلسلے میں امریکی اور برطانوی فوجی جرنیلوں کو تفصیلی بریفنگز پیپرز کا مطالعہ کرنے کی بجائے Go Tell The Spartans نامی قدرے غیر معروف مگر اچھی فلم دیکھ لینی چاہیے جو ایک امریکی ملٹری ایڈوائزر ٹیم سے متعلق ہے۔1964 میں جنوبی ویتنام کی فورسز میں ہزاروں امریکی فوجی ایڈوائزر تعینات تھے مگر جوں ہی اس فوج کو شکست ہوئی تو ان ایڈوائزرز کی اکثریت ان جاسوسوں کی وجہ سے ماری گئی جو اس ویتنامی آرمی میں تھے۔ جلد یا بدیر ان دو میں سے ایک آپشن کو امریکہ کو انتخاب کرنا

ہوگا...... اپنے فوجی مشیر کو نکال لے اور اپنی طفیلیہ ریاست کا انہدام دیکھے، یا ان ایڈوائزرز کو وہیں رکھے اور ان کو قتل ہوتا دیکھے، دوسرا آپشن سیاسی طور پر ناممکن ہے۔ یا پھر یہ کرے کہ اپنی ایک بڑی فوج روانہ کرے جیسا کہ ویتنام کے کیس میں ہوا جس کے تباہ کن نتائج نکلے تھے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی ذمہ دار فوجی افسر یہ چاہے گا کہ اس کے جوان اس حالت تک جا پہنچیں۔

نوٹس

1۔ ایلیسن شا کی کتاب Kinship and Continuity: Pakistani Families in Britain, صفحہ 99

2۔ سٹیفن ایم لیان کی کتاب An Anthropological Analysis of Local Politics and Patronage in a Pakistani Village

3۔ شکار پور میں انٹرویو، نومبر 1988

4۔ محمد اعظم چوہدری کی کتاب، Justice in Practice: The Legal Ethnography of a Punjabi Village

5۔ شجاع نواز کی کتاب، Cross Swords: Pakistan, its Army and Wars Within

6۔ لاڑکانہ میں انٹرویو، 25 اپریل 2009

7۔ دیکھیں تان تائی ینگ کی کتاب The Garrison State: Millitary, Government and Society in Colonial Punjab صفحہ 26

8۔ کراچی میں انٹرویو، یکم مئی 2009

9۔ عدنان عادل کا مضمون Pakistan's Post 9/11 Economic Boom

10۔ جنرل نقوی اور دیگر حکام کی تنقید جن سے میں ملا۔

11۔ دیکھیں عائشہ صدیقہ کی کتاب، Military Inc: Inside Pakistan's Military Economy

12۔ اعداد و شمار فوجی فاؤنڈیشن کی ویب سائٹ پر دستیاب ہیں۔ www.fauji.org.pk

13۔ سٹیفن پی کوہن کی کتاب The Pakistan Army

14۔ شاہد جاوید برکی اور کریگ باکسٹر کی کتاب Pakistan Under Military

15۔ سٹیفن پی کوہن کی کتاب The Pakistan Army

16۔ اسلام آباد میں انٹرویو، پندرہ جولائی 2009

17۔ مملوکوں کے حوالے سے دلچسپ تجزیے کے لیے دیکھیں فرانسس فوکویاما کی کتاب The Origin of Political Order صفحہ 189-228

18۔ پشاور میں انٹرویو یکم ستمبر 2008